جلد01شمارہ 2024،17

Article

Novel: “Tuesday with Morrie”, In the Context of the Meaning of living

ناول: ”منگل والے لوگ“ جینے کے معنی کے تناظر میں

Dr. Muhammad Nasrullah[*1]

[1] Lecturer, Department of Urdu, GCWU, Sialkot.

*Correspondence:

ڈاکٹر محمد نصراللہ[1]

[1]لیکچرار، شعبہ اردو، جی سی ویمن یونیورسٹی، سیالکوٹ

eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813
Received:12-۰٤-202٤
Accepted:16-۰٦-202٤
Online:۲۷-۰٦-202٤

Copyright: © 2023 by the authors. This is an access-open article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: In this essay, the Novel: Tuesday with Morrie, is analyzed in the perspective of the meaning of living. Any text is read indirectly to find the meaning of living; However, this book mainly presents the wisdom of living in the form of fiction. In view of the materialistic thinking of the present time, the problem of the true meaning of life has not been noticed; while this essay sheds light on the meaninglessness and meaning of life in the context of existential philosophy and the life of paralyzed , old character , who is aware of the news of his death. Despite facing the extremes of the darkness in his life, the Old wise man considers learning to die before dying and loving others to be the only logical thing in the world to truly live.

Keywords: Meaning of living, wisdom, Religion, Philosophy, Literature, Darkness, Death, love.

"Tuesday with Morrie"امریکی ناول نگار مچل ڈیوڈ البام(Mitchell David Albom-۱۹۵۸ء)کا ناول ہے۔ اس ناول کا اردو ترجمہ ''منگل والے لوگ'' کے عنوان سے سید سعید نقوی(پ:۱۹۵۹ء) نے کیا ہے۔اس ناول کی کہانی ''سچی'' ہے۔ بالعموم فکشن کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ فکشن وہ دروغ ہے جو جھوٹ ہونے کے باوجود اپنے اثر میں عام سچ سے زیادہ پر تاثیر ہوتا ہے۔بقول ماریو برگھس یوسا:(Mario Vargas Liosa-۱۹۳۶ء)

> ''فکشن ایک دروغ ہے جو ایک عمیق صداقت کو ڈھانپے ہوتا ہے: یہ وہ زندگی ہے جو کبھی واقع نہیں ہوئی ہوتی،ایسی زندگی جو کسی عہد کے مرد وعورت گزارنا چاہتے تھے لیکن نہ گزار سکے،چنانچہ اسے گھڑنے پہ مجبور ہوگئے۔''(۱)

ناول'' منگل والے لوگ'' جھوٹ نہ ہونے کے باوجود عام سچ سے زیادہ گہرا ہے۔یہ وہ''زندگی'' ہے جو گزاری گئی ہے۔جسے گزار کے پھر گزارنے کی خواہش کی گئی ہے۔یہ زندگی مجبوری کے تحت نہیں،شوق سے بنی گئی ہے۔ہاں یہ بات درست ہے کہ سامنے کی زندگی کا سچ جب فکشن کے سچ میں ڈھلتا ہے تو اس سچ کا اثر اپنے وجود میں آنے کے دوران اور بعد میں اور طرح کے اثر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔یہ ناول جھوٹ نہ ہونے کے باوجود عام سچ سے زیادہ اپنے اندر اثر رکھتا ہے تو اس لیے کہ یہ فکشن کے فن کے اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھتا ہے۔ناول مختصر ہے۔ محض ایک سو ساٹھ صفحات پر مشتمل۔قاری کے تجسس،فکر اور احساس کو متحرک رکھنے کے لیے ایک سو ساٹھ صفحات کو بھی چھوٹے چھوٹے اٹھائیس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ابواب کی ترتیب اس طرح سے قائم کی گئی ہے کہ بیان کنندہ اور قاری کا شوق ناول کے کسی مقام پر گھٹ نہ پائے۔ناول دو مرکزی کرداروں کی زندگی کے اہم حصے سامنے لاتا ہے:ان کے ماضی سے(فلیش بیک کی تکنیک کے ذریعے)اور ان کے حال سے۔

پروفیسر موری شوارٹس(Morrie Schwartz-۱۹۱۶ء-۱۹۹۵ء) برانڈیز یونیورسٹی میں سوشیالوجی کے پروفیسر ہیں۔کئی اہم کتابوں کے مصنف ہیں۔مچ البام(راوی و مرکزی کردار) کے پسندیدہ استاد ہیں۔استاد شاگرد ایک دوسرے کی جانب میلان رکھتے ہیں۔دونوں زندگی کے دو مختلف مراحل:''عروج'' و'' زوال'' ؛یعنی جوانی اور بڑھاپے کی تصویر دکھاتے ہیں۔استاد بوڑھا ہے،شاگرد جوان۔استاد بیمار ہے،شاگرد تندرست۔استاد جسمانی سطح پر ٹھہرا ہوا،ختم ہوتا ہوا؛جبکہ ذہنی طور پر زندہ اور زندگی کے آخری مرحلے پہ ہونے کی وجہ سے زندگی کی حقیقت سے متعلق واضح خیالات کا مالک ہے۔شاگرد جسمانی طور پر صحت مند؛جبکہ فکری اعتبار سے ابھی کسی حد تک ضرورت مند ہے۔وہ چاہتا ہے کہ اسے بھی اپنے پروفیسر ہی کی طرح خیالات کی پختگی اور جذبات کی صحت مندی نصیب ہو جائے۔

ناول میں جزوی طور پر پروفیسر موری کی والدہ مرحومہ،سوتیلی ماں(ایوا)،باپ(چارلی)بھائی،(ڈیوڈ)،بیوی(شارلٹ)،بیٹوں(راب اور جون)دوست(نارمن)اور خادمہ(کونی)کا ذکر اور مچ البام کی بڑی بہن،چھوٹے بھائی،بیوی(جینین)اور چچا کا ذکر مرکزی کرداروں کی زندگی کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ٹیڈ کوپل(صحافی)کا کردار بھی ناول کے قابل ذکر ضمنی کرداروں میں سے ایک ہے۔

موری،ایمایوٹرافک لیٹرل اسکلیر وسس(Amyotrophic lateral sclerosis) بیماری کا شکار ہیں۔اعصابی نظام کی یہ مہلک بیماری لاعلاج ہے۔اس بیماری میں آدمی کا وجود موم بتی کی طرح پگھل جاتا ہے۔آدمی جیتے جی مٹی کا ڈھیر بن جاتا ہے۔چلنا پھرنا تو دور کی بات، اپنے سہارے بیٹھ بھی نہیں پاتا۔ڈاکٹروں کی معلومات کے مطابق موری کے پاس ان کی زندگی کے قریباًدو سال باقی رہ جاتے ہیں۔ان سالوں میں سات سو میل کا سفر طے کرکے مچ البام اپنے بوڑھے پروفیسر سے ملنے ہر منگل کو آتا ہے۔ناول بنیادی طور پر مچل اور موری کی منگل کی ملاقاتوں کی روداد کو سامنے لاتا ہے۔مچل ان مکالموں کو ٹیپ ریکارڈر میں ریکارڈ کر لیا کرتے تھے۔انھی ریکارڈنگز اور ناول لکھنے کے اصولوں کی مدد سے وہ ایک ایسی کتاب لکھ پاتے ہیں جو زندگی بسر کرنے کی دانائی کو فکشن کی فارم میں پیش کرتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ فکشن یا فن میں دانائی کے اظہار کی گنجائش ہوتی بھی ہے یا نہیں؟زندگی بسر کرنے کے لیے محض دانائی کا ہونا کافی ہوتا ہے؟ ایک آدمی کے پاس دانائی ہو؛ مگر وہ معاشی، سماجی یا اعصابی طور پر کمزور ہو تو محض دانائی اس کے کس کام کی؟ہم جس دنیا میں ہیں اس میں دانا ہونے کے معیارات کیا ہیں؟ دانائی اصل میں کیا ہے؟ دانائی ایک آدمی کا کس حد تک ؟ کہاں تک ساتھ دے سکتی ہے؟ دانائی کا منبع کیا ہے؟ محض آدمی کے ذاتی یا دوسروں کے تجربات بھی؟

فکشن کی فارم میں زندگی بسر کرنے کی دانائی کا جزوی یا عمومی اظہار محض مذکورہ ناول ہی میں نہیں ہوا؛ بلکہ اردو سمیت دنیا بھر کے ادب اور علوم میں ہوا ہے۔۲

جزوی یا عمومی سطح پر فن میں دانائی کا بالواسطہ اظہار اپنے اندر زیادہ اثر اور معنی خیزی رکھتا ہے۔دانائی کی قلت کو موجودہ زمانے میں جس حد تک موٹیویشنل اسپیکرز نے محسوس کیا ہے،اتنا کسی اور نے نہیں۔یہ اسپیکرز بالعموم زندگی کے ان پہلوؤں کو موضوع بناتے ہیں جن کا تعلق معاشرتی حقیقتوں کے بجائے محض ایک یوٹوپیا سے ہوتا ہے۔یہ سیاست دانوں ہی کی طرح اپنی تقریروں میں مثالی دنیا کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔معروف کتابوں کے مخصوص ٹکڑوں کو بنا اپنی ہستی کا حصہ بنائے،نگلتے اور آگے منتقل کرتے جاتے ہیں۔اپنی ضرورت کے تحت مذہبی حوالوں سے مزین تقریر کے جادو کے ذریعے سامعین کے جذبات میں ایسی وقتی ہلچل پیدا کرتے ہیں کہ ہال تالیوں سے گونج اٹھتا ہے اور انسانی فکر ان لمحات میں نیند کی چادر لیے اونگھ رہی ہوتی ہے۔موٹیویشنل اسپیکرز آج کے زمانے میں نہ صرف سامعین کی معاشی ضرورتوں کو شدت سے محسوس کر رہے ہیں؛ بلکہ روحانی ضرورتوں کو بھی۔ مصنفین کی جماعت میں پاپولر ادیب بھی قاری کی فکر کو زحمت دینا گوارا نہیں کرتے؛ بلکہ ایسے '' شہ پارے'' ترتیب دیتے ہیں جو یا تو آئیڈیالوجیکل ہوتے ہیں یا محض کہانی میں سنسنی خیزی کی بنا پہ تفریح پسند قارئین سے شاباش وصول کرنے کی جدوجہد میں مبتلا ہوتے ہیں۔

تفہیم کی بنیاد پر لکھنے والا ادیب قاری سے اس کے پورے وجود کے جاگتے رہنے کا تقاضا کرتا ہے۔ایسے لکھاری کی بات پرانی ہونے کے باوجود بھی نئی ہوتی ہے کہ یہ بات اس کے اپنے تخیل،اس کی اپنی ہستی کا بھی کا ثمر ہوتی ہے۔مثلاً ناول ''منگل والے لوگ'' میں ایک ایسے بوڑھے کی زبانی زندگی کے معنی بیان کیے گئے ہیں جس کے پاس بہ ظاہر زندگی نام کی کوئی شے نہیں رہ جاتی؛ مگر وہ اپنے سابقہ جینے کے طریق کار کے نتیجے میں تشکیل پانے والی تندرست و توانا روح کے ذریعے، زندگی کے وہ معنی، زندگی کا وہ تفہیم بیان کرتا ہے جسے وہ اپنے گہرے

فکر وجذبات، مطالعات و تجربات اور عمر بھر کی مسلسل کی جدوجہد سے حاصل کرتا ہے۔ گویا ایک ''مردہ جسم'' زندگی کی بات کرتا ہے۔ وہ شخص جسے فطرت نے اس کے جسم کی سلطنت سے بے دخل کر دیا ہے وہ انسانی اختیار کی بات کرتا ہے۔ وہ اپنی قوت سماعت وبصارت، فکر میں پکے ہوئے خیالات، روح میں بھرے ہوئے محبت اور دردمندی کے جذبات کے ذریعے بہ ظاہر تندرست وتوانا نظر آنے والے لوگوں کو زندگی کی صحت مند سانسیں عطا کرنے کی جسارت کرتا ہے۔ زندگی کے ان لمحوں میں کہ جب کوئی آنسو بہائے بغیر، غصے میں آئے بغیر، بہ مشکل ہی کسی سے کوئی بات کرنے کی ہمت کر پاتا ہو، اس ناول کا بوڑھا کردار ان لمحوں میں زندگی اور امید کی بات کرتا ہے۔۔ ول ڈیورانٹ (William James Durant۔۱۸۸۵ء۔۱۹۸۱ء) اپنی آخری کتاب میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''جب زندگی ساتھ چھوڑنے کے مقام پر ہو، اس وقت اس کو سراہنا بہت مشکل ہوتا ہے''(۳)

بوڑھا پروفیسر اپنے مرنے کی خبر سن کر اس بات پر زندگی کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ زندگی نے اسے خداحافظ کہنے کے لیے ڈھیر سارا وقت عطا کر دیا ہے۔ یہ ناول زندگی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، زندگی کو خداحافظ کہتے ہوئے شخص کی کہانی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ اپنے آخری لمحوں میں زندگی کے سب سے بڑے خوف کا سامنا کیسے کرتا ہے:

''میں دوسروں کی طرح کنارہ کشی اختیار کر لوں یا میں اختتام تک زندہ رہوں؟ میں نے فیصلہ کیا کہ میں جیوں گا، یا کم از کم جینے کی کوشش کروں گا، اس طرح جیسے میں جینا چاہتا ہوں، وقار کے ساتھ، بہادری کے ساتھ، ہنستے ہوئے، سکون کے ساتھ۔''(۴)

تھیم کی بنیاد پر زندگی کی کہانی بننے والا'' تخلیق کار'' زندگی یا تخلیق کا سفر کل کے پرزے کی طرح سے طے نہیں کرتا۔ ایسا شخص ہمیشہ بہت جلدی میں نہیں ہوتا۔ وہ زندگی یا تخلیق کے عمل سے سرسری نہیں گزرتا؛ بلکہ فکر وجذبات اور اپنے مشاہدات میں غواصی کے تجربے سے بھی گزرتا ہے۔ وہ زندگی کے ''تجربے'' کو سوچتا، محسوس کرتا، اس میں سے پوری طرح سے گزرتے ہوئے اس کا اظہار کرتا ہے۔ وہ سب کے سامنے پڑی ہوئی حقیقت کی اپنی طرح سے جستجو اور نظارہ کرتا ہے۔ پروفیسر موری بہ ظاہر سب کے سامنے موجود تھے؛ مگر وہ مچل کے سامنے زیادہ موجود تھے۔ سب کو ان کی ضرورت تھی؛ مگر مچل اس طلب کو اپنے اندر زیادہ محسوس کرتا ہے۔

بلااشتباہ مچل موری کی سامنے کی زندگی کو لکھتا ہے؛ مگر وہ اس زندگی کو نئی زندگی بھی عطا کرتا ہے۔ سامنے پڑی ہوئی زندگی کو نئی زندگی عطا کرنا معمولی بات نہیں ہوتی۔ سامنے کی حقیقت کو فن کی حقیقت میں بدلنے کے لیے سامنے کی دنیا میں رہتے ہوئے، سامنے کی دنیا سے، لکھنے والے کا، اپنی، ایک نامانوس دنیا میں، ایک طرح سے عدم میں جانا ضروری ہوتا ہے۔ عدم سے خیال اپنے نئے، انوکھے پن اور نئے احساس کے ساتھ وجود میں آتے ہیں۔ موری اگرچہ اسی دنیا کے ایک باسی تھے؛ مگر مچل انھیں ایک اور ہی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ وہ دنیا جس کے ہونے، وجود میں آنے کا امکان تخلیق کار کی دنیا میں موجود ہوتا ہے؛ مگر اس نے لکھنے سے قبل اس دنیا کو دیکھا نہیں ہوتا۔ جس آدمی نے اس دنیا کی جھلک دیکھی ہو وہ اسے پھر دیکھنے کی آرزو کرتا ہے۔ خیال کی دنیا میں ایک انسان کا دوسرے انسان سے ملنا مختلف طرح کا ملنا ہوتا ہے۔ لکھتے ہوئے کسی

ایک وجود کی داخلی وخارجی دنیا کی حقیقت کو گرفت میں لینے کا تجربہ کسی ایک دھڑکتے ہوئے کائناتی'' ذرے ''کی''زندگی'' کی کلی حقیقت کو،خود اپنی ہستی کی حقیقت کو سمجھنے،اس کو پھیلانے،کشادہ کرنے اور'' زندگی'' سے بغل گیر ہونے کی آرزو کے مترادف ہے۔مچل موری کی زندگی میں دلچسپی لیتا،اس سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔وہ اس سے ہم آہنگ ہونے کے نتیجے میں اپنی ذات کو فراخ کرتا ہے۔زندگی ہر ایک کو مختلف راستوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا موقع دیتی ہے۔ایک راستہ بالکل الگ تھلگ، تن تنہا چلنے کا راستہ ہوتا ہے۔ ایک راستہ دوسرے راستے سے ہم آہنگ ہونے کا راستہ ہوتا ہے۔ہر راستہ اپنے آغاز وانجام میں تنہا ہوتا ہے۔ہر راستے کا مقدر بالآخر تنہائی ہے۔پہاڑوں سے پگھلنے والی برف کا پانی زمین پہ کئی حصوں، کئی راستوں میں تقسیم ہوتا چلا جاتا ہے۔الگ الگ راستوں پر چلتا ہوا پانی بھی بالآخر ایک ندی میں جاملتا ہے۔ندی کو نہیں معلوم ہوتا کہ وہ راستے ہی میں کہیں سوکھ جائے گی یا اس کے مقدر میں کسی دریا یا سمندر سے مل جانا بھی ہوگا۔ندی اپنے بننے میں، چلنے میں،اپنے پورے سفر میں محض فطرت کے رحم وکرم پر ہے۔کاش ایسی بے اختیاری انسان کے نصیب میں بھی ہوتی؛مگر انسان کے پاس اختیار کی معمولی سی قوت انسانی دنیا میں کیسے کیسے رنگ دکھاتی ہے۔ان طرح طرح کے رنگوں کو اپنی سہولت کے لیے ہم دو حصوں: سیاہ اور سفید میں تقسیم کرتے ہیں۔مچل اور موری ہر اعتبار سے دوسرے راستے کے مسافر ہیں۔وہ ایک دوسرے کی ہستی سے ہم آہنگ ہونے کا تجربہ کرتے ہیں۔ مچل نہیں چاہتا کہ موری کے پکے ہوئے خیال، پکے ہوئے پھلوں کی طرح کسی باغ میں گر جائیں؛مگر کسی کے کام نہ آسکیں۔موری بھی یہی چاہتے تھے کہ یہ خیالات محفوظ ہوجائیں۔مچل ان خیالات کو اپنی روح میں سمولیتا ہے۔وہ فکشن کی فارم میں انھیں پیش کرتا ہے۔مچل کس بنا پہ موری کی شخصیت کو اہم جانتا ہے؟وہ کون سے خیالات ہیں جو اس ناول کا موتیف ہیں؟ان سوالات کے تفصیلی تجزیے سے قبل،ابھی پہلے سے اٹھائے گئے سوالوں کے جوابات پر توجہ دینا باقی ہے۔

زندگی بسر کرنے کے لیے آدمی کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے،وہ دانائی ہے۔دانائی پیسہ کمانے،سماجی تعلقات بنانے اور اپنا خیال رکھنے کے عوامل کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھتی؛تاہم شخصی طور پر دولت مند ہونا،سماجی طور پر طاقت ور ہونا اور محض اپنا ہی خیال رکھے چلے جانا دانائی کے معیارات کے لیے ناکافی ذرائع ہیں۔دانائی انسانیت کے دل میں حقیقی محبت اور عزت کے جذبات بیدار کرتی ہے؛جبکہ محض بڑی ڈگری، گریڈ،طاقت، بڑے گھر، بڑی گاڑی اور دولت کے رعب کی بنا پہ دوسروں کے دل میں اپنے خالی ہونے کا احساس تو پیدا کیا جاسکتا ہے؛ سچی عزت اور محبت کا نہیں۔دانائی خود کو اور دوسروں کی حقیقت کو جانتے ہوئے زندگی کو کوئی معنی، کوئی مقصد دینے کے نام سے عبارت ہے۔دانائی کسی شخص کے مقدر میں آجائے تو یہ کسی بھی طرح کے اختیار کے استعمال کے معاملے میں حد درجہ محتاط، دیانت دار، جرات مند اور درد مند ہوتی ہے۔آدمی کے پاس کچھ بھی نہ ہو تو وہ اپنے شعور کو بروئے کار لا کر اپنی کمیوں کو پورا کر سکتا ہے؛مگر دانش نہ ہو تو اسے دولت اور طاقت کی بنا پر حاصل نہیں کر سکتا۔دانش حاصل کرنے کے لیے آدمی کو جس شے کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے وہ دانش کی سچی طلب ہے۔دانش کی طلب کسی کے اندر پیدا نہیں کی جاسکتی؛البتہ اس طلب کی ضرورت واہمیت کی طرف توجہ ضرور دلائی جاسکتی ہے۔کوئی طالب ہو تو وہ جاننے کی پیاس کی بدولت بے ساختہ جاننے کے معانی تک پہنچنے کی جستجو کرتا ہے۔ معنی تجریدی فارم میں ہوتا ہے تو مجسم فارم میں بھی۔مچ البام معانی کی دونوں سطحوں کو چھونے کا تجربہ کرتے ہیں۔زندگی کی بھٹی میں جل جل کے موری کا وجود مجسم معنی بن

کے رہ گیا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ زندگی کی آگ میں جل کے ان کی نرم مٹی پتھر نہیں بنتی۔ معنی کا چشمہ ان کے ناکارہ جسم میں خشک نہیں ہو پاتا۔ وہ چشمہ اپنی آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔ مجّل اسی چشمے کی جستجو میں سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے اس کے پاس پہنچتے ہیں۔ زندہ وجود کو آخری سانس تک اس چشمے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آخری سانس تک آدمی کو محنت، حوصلے، ہمت، جرات، صبر امید اور ''خود'' کو دلاسا دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آدمی اپنے آپ سے بھی معنی کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ معنی کی خاطر آدمی سفر کی، خود کلامی کی، پڑھنے، لکھنے اور مکالمے کی ضرورت بھی محسوس کرتا ہے۔ مجّل کا جہاز سے موری تک پہنچنے کا سفر اپنی ہستی سے باہر معانی تلاش کرنے کا سفر تھا؛ مگر متناقضاتی طور پر یہ باہر کا سفر بھی اس کے اندر کا سفر تھا۔ مجّل کی داخلی دنیا میں اپنے سے باہر معنی سے بغل گیر ہونے کی خواہش موجود تھی۔ موری کی لاشعوری و اجتماعی لاشعوری دنیا میں بھی معانی کو تقسیم کرنے کی خواہش پنہاں تھی۔ مجّل یہ ناول لکھ کے ایک طرح سے معانی کی امانت کو تقسیم کرنے کا اعادہ کرتے ہیں:

> ''اس چکر میں اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ ہم اپنے آپ سے سوال کرنے کی عادت ڈالیں۔ کیا زندگی بس یہی ہے؟ کیا میں زندگی سے بس یہی چاہتا ہوں؟ کچھ کمی نہیں رہ گئی۔۔۔ ہمیں ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی دوسرا ہمیں اس کا احساس دلائے۔ یہ خود بخود نہیں ہو جاتا۔ ان کی بات میری سمجھ میں آ رہی تھی۔ ہم سب کو زندگی میں ایک راہ نما کی ضرورت ہوتی ہے اور میرا استاد، میرا راہ نما میرے سامنے بیٹھا تھا۔'' (۵)

موجودہ عہد کا آدمی بھی وقت کے چاک کے ارد گرد گھومتا رہتا ہے؛ مگر رکنے کی اہمیت سے واقف نہیں ہو پاتا۔ وقت کا خیال اس کے اندر عجلت کے احساس کو بڑھانے کا کام مستقلاً کرتا رہتا ہے۔ نظر نہ آنے والا وقت پہلے پہل صنعتی عہد میں گھنٹہ گھروں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ پھر وہ گھروں کی دیواروں سے رینگتا ہوا ہمارے ہاتھوں کی کلائیوں میں آ بندھا۔ گھڑیوں سے موبائلوں میں آیا اور اب حقیقت یہ ہے کہ وقت انسانی ذہن میں اس قدر سرایت کر گیا ہے کہ ہر کوئی بنا گھڑی دیکھے قریب قریب وقت کا صحیح اندازہ کر سکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں وقت محض پیسے اور مفاد کا متبادل بن کر رہ گیا۔ وقت محبت، بے غرضی اور معنی کا متبادل نہیں بن سکا۔ موری نے وقت کے خارجی تصور کو اپنے اوپر سوار نہیں ہونے دیا۔ وہ اپنی مرضی اور آزادی کے ساتھ وقت گزارنے کے قائل تھے۔ انھوں نے بیمار ہونے سے پہلے بھی وقت کی غلامی قبول نہیں کی تھی۔ بیمار ہونے کے بعد تو وہ کلی طور پر وقت کی قید سے آزاد ہو گئے تھے۔ وہ ٹھہر کر اپنے آس پاس کے ہر وجود کا، زندگی کی ہر حرکت کا مشاہدہ کرنے کے ماہر ہو گئے تھے:

> ''میں مکمل سپردگی پر یقین رکھتا ہوں۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس وقت جس کے ساتھ ہو، پوری طرح اس کے ساتھ ہو، پوری طرح سے اس کے ساتھ رہو۔۔۔ مجھے یاد ہے یہ بات وہ ہمیں برینڈیز یونیورسٹی میں گروہی عملیات کی کلاس میں سکھاتے تھے۔ میں کتنا چڑا تھا کہ یہ بھلا کوئی یونیورسٹی میں پڑھانے کا کورس ہے، توجہ مرکوز کرنا سیکھو۔ اس بات کی بھلا کتنی

> اہمیت ہو سکتی ہے ؟اب مجھے پتہ ہے کہ یہ شاید کالج میں پڑھائی جانے والی دیگر تمام چیزوں سے زیادہ اہم تھی۔'' (۶)

مہاتما بدھ بھی اسی فلسفے کے قائل تھے:

> ''جب کچھ دیکھا جا رہا ہو تو صرف دیکھنا چاہیے اور جب سنا جا رہا ہو، تو صرف اسی کو سننا چاہیے اور جب محسوس کیا جا رہا ہو (اس میں سونگھنا، دیکھنا اور چھونا شامل ہیں) تو پھر اسے ہی محسوس کرنا چاہیے اور جب ہم سوچنے کی کیفیت میں ہوں تو پھر اس کو سوچنا چاہیے!'' (۷)

وہ زمانہ کہ جس میں وقت نے آدمی کے اندر مشین کی مانند تیز ہونے کا خیال پیدا کیا۔ وہ زمانہ کہ جس میں نت نئی سے نئی چیزوں کی خرید و فروخت کی دوڑ میں جینے کا مفہوم، جینے کے معانی دھندلے ہوتے جا رہے ہیں، اس صورت حال میں ایک بوڑھے دانش مند کی زندگی ہماری توجہ جینے کے معانی پر پڑی گرد اور اس گرد کے نیچے کی تہہ کی طرف دلاتی ہے۔ جینے کا معنی و مقصد آج ہی کے انسان کا مسئلہ نہیں، یہ ہمیشہ سے انسانی زندگی کا اہم موضوع رہا ہے۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء۔۱۹۵۸ء):

> ''زندگی بغیر کسی مقصد کے بسر نہیں کی جا سکتی۔ کوئی اٹکاؤ، کوئی لگاؤ، کوئی بندھن ہونا چاہیے جس کی خاطر زندگی کے دن کاٹے جا سکیں۔'' (۸)

جینے کا مقصد صرف فلسفے کا نہیں، مذہب، ادب اور دیگر علوم کا بھی اہم موضوع ہے۔ مذہب، تصوف، اخلاقیات اپنے ڈھنگ سے جینے کے معانی تلاش کرتے ہیں، ادب، فلسفہ، نفسیات اور فن اپنے رنگ سے۔ اول الذکر بالعموم معلوم کی دنیا سے اپنی تشفی کا سامان اکٹھے کرتے ہیں ؛جبکہ ثانی الذکر نامعلوم، نادیدہ چشموں کی جستجو بھی کرتے ہیں۔ پہلی قسم کے سفر میں آدمی خود کو پہلے سے موجود ایک پناہ گاہ میں محفوظ سمجھتا ہے؛ جبکہ دوسری قسم کے سفر میں آوارگی، بے گھری، بے چینی اور تنہائی کے تجربے سے گزرتا ہے۔ پہلا سفر پہلے سے موجود معنی کے گھر میں زندگی کے دن گزارنے کا سفر ہے؛ جبکہ دوسرا سفر معنی کی، اپنے گھر کی از خود تخلیق کا سفر ہے۔ ان دونوں طرح کے اسفار کی منزل بالآخر ایک ہو سکتی ہے؛ تاہم تخلیق کار کے لیے تخلیق کا سفر زندگی کے تجربے کا سفر ہوتا ہے۔ یہ سفر پہلے سفر سے کہیں زیادہ پر خطر، مشکل؛ مگر اپنی روح میں زیادہ زندہ سفر ہونے کے امکانات رکھتا ہے۔ اس سفر میں آدمی کا پورا وجود فکر و احساس کی سطح پر سفر میں ہوتا ہے۔ آدمی کسی لمحے بھی اپنے وجود کو دوسروں کے سہارے، بنے بنائے راستوں پر آزاد نہیں چھوڑ پاتا۔ کوئی اپنے آپ کو پہلے سے بنے بنائے پل پر چلنے کے لیے اس لیے بھی آمادہ نہیں کر پاتا کہ ممکن ہے اس نے اس پل کو اپنی آنکھوں سے گرتے ہوئے دیکھا ہو۔ مچل اور موری دوسری قسم کے راستے کے مسافر ہیں۔ وہ اپنے لیے اپنے پل اور معانی خود پیدا کرتے ہیں۔ آدمی جب اپنے لیے معنی یا معنی کا گھر پیدا کرتا ہے تو یہ محض وہ اپنے لیے پیدا نہیں کرتا۔ یہی معنی کا حسن، یہی معنی کی فراخ دلی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ معنی میں جان ہو۔ معنی آدمی کے اندر زندہ ہو تو اپنا اظہار کرتا ہے۔ یہ کھیتی سوکھ جائے تو اپنے آس پاس کے کھیتوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ معاصر صورت حال میں ''علم''، ''طاقت''، ''پیسہ''، دیگر سہولتوں کی فراوانی، تعلیمی اداروں اور ''دانشوروں'' کی بہتات کے باوجود زندگی کی بے معنویت کا احساس پہلے سے کہیں زیادہ کیوں بڑھا

ہے؟ سینکڑوں قسم کی مشینیں ہونے کے باوجود وقت بڑھنے کے بجائے لوگوں کے پاس وقت، زندگی اور توجہ کے ارتکاز کا احساس کم کیوں ہوا ہے؟ لالچ، حسد، غصہ، ہر طرح کا منفی جذبہ پہلے سے بڑھ کے کیوں بڑھا ہے؟ بہت زیادہ انسان ہونے کے باوجود انسان کم کیوں ہوتے جا رہے ہیں؟ وہ کون ہیں جو آدمی کے اندر سوئے ہوئے منفی انسان کو جان بوجھ کر جگاتے ہیں؟ کون ہیں جو نہتوں پر بم گراتے ہیں؟ ابن آدم سب کچھ پا کے بھی اپنے اندر ویران کیوں ہے؟ وہ اتنا بااختیار ہو کے بھی اتنا بے بس کیوں ہے؟

اس ''بربادی'' اور ویرانی کے احساس کی جڑیں کچھ تو آدمی کے ''ہونے'' کے مسئلے کے اندر پھیلی ہوئی ہیں اور کچھ اسباب کا تعلق انسان کے طرز فکر و عمل، اس کے ضابطہ حیات سے جڑا ہے۔ یعنی آدمی اپنی داخلی دنیا کو اس صورت میں بھی بکھرا ہوا پاتا ہے جب اس کے پاس جینے کا ڈھنگ، جینے کا معنی و مقصد نہیں ہوتا۔ آدمی مکمل طور پر اپنے'' ہونے ''کی صورت حال کو موردِ الزم نہیں ٹھہرا سکتا۔ وہ اپنے شعور کو بروئے کار لا کر اپنے اختیار کی دنیا کو بھی استعمال میں لا سکتا ہے۔

وجودی فلسفہ سوال اٹھاتا ہے کہ آدمی اس زمین پر کس مقصد کے تحت آیا؟ کس کی مرضی کے تحت آیا؟ وہ کیوں؟ کس لیے اپنا سفر جاری رکھے؟ کیا وہ یہ مسلط کردہ چکر پورا کرنے کا پابند ہے؟ وہ آ ہی گیا ہے تو اب زندگی کے ساتھ مشین کے پرزے کی طرح کا تعلق قائم کرے یا آزادی کی جستجو کرے؟ آدمی آزاد کیسے ہوتا ہے؟ ایک غلام ملک کے کیا تمام باشندے غلام ہوتے ہیں؟ یا مابعد نوآبادیاتی زمانے میں بھی ایک آدمی آزاد ہونے کا خواب دیکھ سکتا ہے؟ آدمی اپنے'' ہونے ''کے ساتھ، فطرت کی طرف سے آنے والی مصیبتوں (بیماری، بڑھاپا، موت، زلزلہ، سیلاب)، اپنے وجود کے تاریک پہلوؤں، ایک بنجر سسٹم اور سماج کے ساتھ کیسے رشتہ استوار کرے؟ البرٹ کامیو (Albert Camus۔۱۹۱۳ء۔۱۹۶۰ء) کے خیالات کے مطابق:

> ''مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کی ہماری یہ جستجو کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی، کیونکہ کوئی مفہوم موجود ہی نہیں، جسے دریافت کیا جائے۔ دنیا، زندگی یا تاریخ وغیرہ کے معنی وہی ہیں، جو ہم ان سے منسوب کریں۔ انسان سے ماورا کوئی ہستی موجود نہیں، جو انہیں کوئی مفہوم دے سکے۔ اس امر کے شعور سے لغویت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ غیر معقول کائنات کے سمجھنے کی جدوجہد ہی لغویت کا سبب ہے۔''(۹)

زندگی جو ہے، جیسی ہے، اس سفر کو مکمل کیے بغیر کسی کے پاس دوسرا کوئی چارہ نہیں۔ وجودیت پہلی سطح پر آدمی کو تنہا، بے سہارا اور مایوس کرتی ہے۔ آدمی کو اپنے اختیار، انتخاب، فیصلے اور ذمہ داریوں کا احساس دلا کر اسے مشکل میں ڈال دیتی ہے؛ مگر اپنی اگلی سطح پر امید کے احساس کو بیدار کرتی ہے۔ البرٹ کامیو ہی، جو دنیا کو لغو(Absurd) قرار دیتے ہیں، زندگی کے مقصد کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں:

> ''جو لوگ یہ جانتے ہوئے کہ فتح و شکست دونوں فضول ہیں، جابر بادشاہ کے خلاف بغاوت کرتے ہیں، وہ اپنی اولوالعزمی دکھاتے ہیں اور آزادی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہر شخص کو جان لینا

چاہیے کہ تمام افعال کی قیمت مساوی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اپنے آپ کو کسی لائحہ
عمل کا پابند کیا جائے اور اس کو نبھانا زندگی کا مقصد بنالیا جائے۔"(۱۰)

کوئی معقولیت سے دنیا کی لغویت(Absurdity) کو، اپنے وجود کی سیاہ وسفید حقیقت کو سمجھ لے تو اس کے اندر زندگی کے اجلے حصے کو پانے کا، زندگی کو ڈھنگ سے گزارنے، اس کا سامنا کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اسی ذہنی صورت حال میں آدمی اپنے اختیار کی طاقت کو ممکن حد تک استعمال میں لاکر اپنے لیے آزادی تخلیق کرنے کی کاوش کرتا ہے۔ جو اپنے ہونے کو قبول کرلیتا ہے وہ ہمت کرکے اپنے نہ ہونے کی حقیقت کا سامنا کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ اپنے ہونے کے دوران کوئی آدمی فطرت اور سماج کے جبر وکرم سے گزرتے ہوئے کرم کے دائرے کو وسیع کرتا ہے تو کوئی اسے تنگ کرتا ہے۔ گویا وجودیت آدمی کو آزادانہ اپنے اختیارات کے استعمال کی امید دلاتی، خود سے زندگی کو معنی عطا کرنے کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ بقول ژاں پال سارتر(Jean Paul Sartre۔۱۹۰۵ء۔۱۹۸۰ء):

"آزادی کو ہمیشہ تخلیق کرنا پڑتا ہے۔ اہم بات یہ جاننا ہے کہ آیا تخلیق آزادی کے نام پر کی گئی
ہے یا نہیں؟۔۔۔ جب تک زندگی بسر نہ کی جائے زندگی کچھ بھی نہیں ہوتی لیکن مفہوم تو آپ
ہی نے عطا کرنا ہے اور ان معنوں کے علاوہ جن کو آپ منتخب کرتے ہیں، اس کا اور کوئی مفہوم
نہیں۔"(۱۱)

کولن ولسن(Colin Wilson۔۱۹۳۱ء۔۲۰۱۳ء) کی فکر سارتر کے سامنے یہ سوال رکھتی ہے کہ آدمی آزاد ہو کر اپنی آزادی سے کام کیا لے؟ دوسرا یہ سوال کہ وہ نصب العین کا انتخاب کیا کرے؟ بقول کولن ولسن:

"فرد آزاد ہے، لیکن دنیا لغو ولایعنی ہے۔۔۔ یہ ہے مسئلہ۔" (۱۲)

سارتر کے خیال کے مطابق ہر شخص کو آزاد ہونے کے بعد اپنے نصب العین کا تعین خود ہی کرنا ہوتا ہے۔ دنیا جیسی بھی ہے، جو بھی ہے، اسے خود دنیا کو، اپنی زندگی کو معنی دینے ہوتے ہیں۔

زندگی ہر جگہ پہ ایک جیسی نہیں ہوتی۔ یہ حقیقت ہے کہ نوآبادیاتی عہد ختم نہیں ہوا، اس عہد کے اثرات ابھی تک جاری ہیں؛ اب اس صورت حال میں مابعد نوآبادیاتی باشندے کیا کریں؟ وہ باشندے جن کا اس غلامی میں کوئی دوش نہیں؟ جنھیں ذرا سا ہوش آیا تو انھیں معلوم ہوا کہ وہ غلام ہیں۔ اب وہ نر دوش نوجوان اپنا ہر لمحہ غلامی کے احساس میں گزار دیں یا اپنا ہر لمحہ مزاحمت کی نظر کردیں؟ اپنے غلام ہونے کی حقیقت کا احساس بری شے ہے نا ہی غلامی کے خلاف مزاحمت قابل مذمت رویہ ہے؛ تاہم اپنی مشکل صورت حال میں جینے کی آرزو، جینے کے معنی کی تلاش کا رویہ اپنی جیسی تیسی صورت حال میں سے آزادی کشید کرنے کی جستجو کرنے کے مساوی رویہ ہے۔ یہ رویہ مایوسی اور بزدلی کی کوکھ سے نہیں، امید اور جرات مندانہ سوچ سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے" دیوتاؤں "نے ہمیں آج تک کیا دیا؟ کیسے دیا؟ ہم نے اپنے سماج کو آج تک کیا دیا؟ کیا دے رہے ہیں؟ اس سوال کا جواب سب کے سامنے ایک جیسا نہیں آئے گا۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جنھوں نے مشکل صورت حال میں بھی زندگی کے معنی کو ڈھونڈا، اسے سنبھالا دیا ہوگا۔ جنھوں نے لغو ماحول میں بھی زندہ رہنے کی، زندہ رکھنے کی ذمہ

داری احسن طریقے سے نبھانے کی استطاعت بھر کوشش کی ہوگی، کر رہے ہوں گے۔ جو کسی کو نقصان پہنچائے بغیر اپنے تئیں معنی کی تلاش میں سر گرداں ہوں گے۔ اس سیاق کے تناظر میں ناول ''منگل والے لوگ'' کے مرکزی کردار کا طرز حیات توجہ طلب ہے۔ وہ بچپن اور بڑھاپے میں اپنے وجود کو شدید خطرے کی زد میں پاتا ہے۔ پیدا ہوتا ہے تو فطرت اس سے اس کی ماں چھین لیتی ہے۔ بچپن ہی میں (نو برس کی عمر میں) اسے غربت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اخبار بیچ کر اپنے گھر والوں کی مدد کرتا ہے۔ فطرت اور سماج دونوں موری کو مشکل امتحانات میں سے گزارتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فطرت موری کو بوڑھا کرتی، شدید حد تک بیمار و لاچار کرتی ہے؛ لیکن اپنے وجود کی لایعنی صورت حال میں بھی وہ اپنے لیے، دوسروں کے لیے معنی تلاش کرتا ہے۔ معلوم دنیا سے موت کی خبر آنے کے نتیجے میں وہ زندگی کے معنی سے، زندگی کی حقیقت سے دیانت دارانہ طور پر آگاہ ہو جاتا ہے۔ زندگی کی آخری حقیقت سے آگہی کے نتیجے میں وہ جن باتوں کو زیادہ اہم جانتا ہے وہی اس ناول کا موتیف ہیں۔ انھی باتوں کی اہمیت کو مچل کے ذہن میں واضح کرنے کے لیے وہ ان کا تذکرہ بار بار کرتا ہے۔ محبت، موت، معاشرہ، خاندان، عفو و در گزر، خود آگہی، جذبات اور بامعنی زندگی موری کے لیے اہم موضوعات ہیں۔

۷۶ برس کی عمر میں جان لیوا بیماری کی خبر سننے کے باوجود موری کا زندگی سے فرار کے بجائے امید اور وابستگی کا تعلق اس کے کردار میں ایسی جاذبیت پیدا کرتی ہے کہ قاری اس کی صحبت میں اپنے اندر سوئے ہوئے زندگی کے جذبات کو جاگتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ موری نے غربت، بیماری، دکھ میں، تکلیف میں، زندگی کے ہر موڑ پر زندگی سے دانائی، محبت، دردمندی اور معنی کا تعلق قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کڑی آزمائش کی گھڑی میں کہ جب موت آدمی کے سر پہ کھڑی ہو زندگی میں معنی تلاش کرنا معمولی بات نہیں ہوتی؛ مگر موری نے ایسا کیا تو اس کے اس عمل کے پس پردہ جذبہ ہمت کی کارفرمائی سے انکار ممکن نہیں۔ اس کے اسی رویے نے اس کو حقیقی معنوں میں زندگی سے آزادی کا رشتہ استوار کرنے کا موقع دیا۔ بقول البرٹ کامیو:

''جسے پھانسی کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ صرف وہ آدمی آزادی کا تصور کر سکتا ہے۔''(۱۳)

زندگی سے آزادی کا رشتہ قائم کرنے کے نتیجے ہی میں موری کو جینے کا، محبت اور دردمندی کے گہرے جذبات کو سمجھنے، محسوس کرنے اور ان کے اظہار کا زیادہ حد تک موقع ملا۔ واضح رہے کہ موری کی شخصیت پر جذباتیت کا غلبہ نہیں ہے تاہم موری جذبات کو فکر سے زیادہ عزیز جانتے ہیں کہ یہی جذبات آدمی کے اندر زندہ رہنے اور زندہ رکھنے کی امنگ پیدا کرتے ہیں۔

مچل موری کے طرز فکر و حیات کی بنا پہ اس کی شخصیت کو اہم جانتا ہے۔ موری اپنی فکری دنیا میں جس معاملے کو کلیدی اہمیت دیتے ہیں وہ ہے جینے کے معنی، جینے کے آرٹ کا معاملہ۔ موری یہ سمجھتے ہیں کہ لوگ اپنی زندگی میں بہ ظاہر سب کچھ پا کر بھی اپنی ہستی کو اکثر اوقات خالی محسوس کرتے ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انھیں جینے کا معنی و مقصد اور طریقہ ہی نہیں ملا ہوتا۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ اپنے لیے کیا چاہتے ہیں؟ کتنا چاہتے ہیں؟ کیوں چاہتے ہیں؟ وہ بہ ظاہر اپنے لیے بہت کچھ کر رہے ہوتے ہیں؛ مگر حقیقت میں اپنے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہے ہوتے۔ ایسے لوگوں کو بہ ظاہر اپنا آپ بڑا عزیز ہوتا ہے؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کے اور سماج کے دشمن ہوتے ہیں۔ وہ اکثر آلودہ ذہن ہوتے، آلودگی پھیلاتے ہیں۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ، دوسروں پر نہیں، اپنے آپ پر ''رحم'' کھانے میں گزر جاتا ہے:

''بہت سے لوگ بے کار زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ مجھے نیم خوابیدہ لگتے ہیں، چاہے اپنے تیئں کوئی اہم کام ہی کیوں نہ سرانجام دے رہے ہوں۔ اس لیے کہ یہ لوگ غلط چیزوں کا تعاقب کر رہے ہیں۔''(۱۴)

''مچ، ایک تو مسئلہ یہ ہے کہ ہر آدمی بہت جلدی میں ہے،'' وہ بولے ''لوگوں کو اپنی زندگی میں کوئی مقصد نہیں ملا، بس وہ ہر وقت اس کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ان کا خیال ہوتا ہے کہ شاید اگلی گاڑی، اگلا گھر یا اگلی نوکری۔ پھر پتہ چلتا ہے کہ یہ سب بھی خام ہے تو پھر سرگرداں ہو جاتے ہیں۔''(۱۵)

''ہم لوگ بے معنی گفتگو میں کتنے ماہر ہیں ''آپ کیسے ہیں''، '' رہائش کہاں ہے آپ کی؟'' لیکن واقعی کسی میں دلچسپی لینا۔ انہیں کچھ فروخت کرنے کی کوشش کے بغیر، ان سے کچھ طلب کئے بغیر، اپنے مقصد کے لئے استعمال کئے بغیر، جواب میں کسی فائدے کی امید کے بغیر۔۔۔اب یہ کہاں ہوتا ہے۔'' (۱۶)

مذکورہ اقتباسات ان لوگوں کی زندگی کے ترجمان ہیں جنھیں جینے کا معنی و مفہوم نہیں ملا ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ موری کے نزدیک جینے کے معنی سے کیا مراد ہے؟ یا موری جینے کے معنی تلاش کرنے کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کرتے ہیں؟

موری جینے کے لیے، لمحہ حال پر، فکر و احساس کے تحرک کے ساتھ، توجہ دینے کا طریقہ کار اختیار کرتے ہیں۔ وہ دیانت داری سے موت کی یاد کو، اس کی حقیقت کو تصور کرنے کے عمل پر عمل پیرا ہوتے ہیں؛ نیز تمام تر کمزور جذبوں کو سمجھنے، ان کا سامنا کرنے کے طریقوں کو جانتے ہیں:

''ہماری تہذیب ہمیں وقت سے پہلے موت کے بارے میں سوچنے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتی۔''(۱۷)

''سب کو معلوم ہے کہ انہیں ایک دن مرنا ہے۔۔۔ لیکن لگتا ہے یقین کسی کو بھی نہیں۔ ہمیں یقین ہوتا تو ہمارے رویے مختلف ہوتے۔۔۔ہاں لیکن اس کے بارے میں ایک زیادہ مثبت رویہ بھی ہو سکتا ہے۔ ہم ہر وقت موت کو یاد رکھیں، اور ہر لمحہ اس کے لیے تیار بھی رہیں۔ یہ یقیناً بہتر طریقہ ہے۔ اس طرح ہم جب تک زندہ ہیں زندگی کو بہتر طور پر جی سکتے ہیں۔''(۱۸)

موری مچل سے یہ بات ایک بار نہیں، بار بار کہتے ہیں:

'' سچ تو یہ ہے مچ، کہ ایک دفعہ تمھیں مرنے کا سلیقہ آجائے تو جینے کا ہنر بھی پالو گے۔''(۱۹)

جینے سے پہلے مرنا متناقضاتی حقیقت ہے۔ آدمی اپنے تصور میں موت جیسی بڑی اور ''خوف ناک'' حقیقت کا پوری دیانت داری سے سامنا کرلے تو وہ زندگی کے دیگر منفی پہلوؤں، جذبوں، فکروں اور پریشانیوں پر بھی قابو پاکے زندگی سے بڑی حد تک آزادی کا رشتہ قائم کرنے کا تجربہ کرسکتا ہے۔ آدمی کی زندگی کو محض سماجی واقتصادی صورت حال ہی سے نہیں، اپنے خیالات سے بھی خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ اپنے ماضی قریب سے متعلقہ گدلے خیالات، دوسروں کی ذہنی دنیا سے متعلق طرح طرح کے گمان، پھر اپنے اور بچوں کے مستقبل سے جڑے کمزور خیالات آدمی کے حال و مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پیچھے رہ جانے کا، نوکری کے ہاتھ سے چلے جانے کا ڈر، محبوب کے چھوڑ جانے کا، اولاد کے چھن جانے کا خوف، بیماری و بڑھاپے کا، اپنی تنہائی و رسوائی کا خوف اور سب سے بڑھ کے موت کا خوف آدمی کو مرنے سے پہلے بار بار مارتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ سارے خوف ہمارے روز مرہ کے شعور کا حصہ ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہنستے بستے جوان کو اچانک ایک مہلک بیماری آلیتی ہے۔ ہم جوان لوگوں کو بوڑھا ہوتے اور اپنے بزرگوں کو یہ دنیا چھوڑتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ہم فطرت کو، سماج کو؛ حتیٰ کہ بعض اوقات اپنے آپ کو بھی خودسری سے کام لیتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ہمارے خوف سراسر بے جا نہیں ہیں؛ مگر کیا ہم ان اندیشوں اور وسوسوں کو اپنی ہستی کے اوپر حاوی ہونے دیں؟ انھیں اجازت دے دیں کہ یہ ہمارے پاس موجود صحت مند لمحوں کو بیمار کردیں؟

کسی بھی طرح کے خوف کے زیر اثر جینا مرنے سے پہلے مرنے، بے لطف زندگی کاٹنے کے ہم معنی ہے؛ جبکہ ہر طرح کے خوف کی انتہا کا سامنا کرکے، اس کے روبرو ہو کے، اسے اپنی ہستی کے اندر سے گزار کے، اس سے آگے گزر کے، بہتر، اجلے لمحوں میں آجانے کا عمل'' مرنے کے بعد'' جینے کے ہنر کو پانے کے مترادف ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ آسان نہیں ہے؛ مگر اس بار بار کی جدوجہد کے بغیر آدمی صحت مندی کے ساتھ جینے کا تجربہ نہیں کرسکتا۔ کوئی بھی خوف آدمی کے ذہن پہ اس وقت تک دستک دیتا رہتا ہے جب تک کہ ذہن اس خوف سے پوری طرح سے ہم کلام نہیں ہو پاتا۔ ذہن کے خوف سے مکالمہ کرنے کے نتیجے میں خوف کی جڑیں رفتہ رفتہ کمزور ہونا شروع ہو جاتی ہیں؛ جبکہ ذہن کے خوف سے، اپنی زندگی کے منفی پہلوؤں سے پردہ پوشی کے نتیجے میں خوف کی یا منفی پہلوؤں کی جڑیں پہلے سے بڑھ کے مضبوط ہو جاتی ہیں۔ ذہن کی عادت ہے خطرے کی گھنٹی بجانا۔ ذہن کے ساتھ خطرے اور خوف کا احساس انسانی ارتقا کے دوران چمٹا۔ جنگل سے یہ کھٹکا انسان اپنے ساتھ ہی لے آیا۔ منفی سے منفی، ایک سے بڑھ کے ایک بزدلانہ خیال کو پیدا کرکے انسان کے سامنے لا کھڑا کرنا ، زندگی، فطرت اور سوچ کی اولین سطحوں کی، انسانی ذہن کے نشوونما پانے کے زمانے کی یاد دلاتا ہے۔ کسی بھی منفی خیال یا خطرے کی صورت میں آدمی کے پاس دو راستے ہوتے ہیں۔ ایک خطرے کو کسی نہ کسی طرح سے ٹالنے کا راستہ، دوسرا خطرے کا سامنا کرنے کا راستہ۔ سچ تو یہ ہے کہ آدمی کے اندر خطرات کا سامنا کرنے کی، خطرات پر حاوی ہونے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے؛ مگر یہ صلاحیت اس وقت تک پوشیدہ رہتی ہے جب تک کہ اسے اظہار کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ ہر آدمی ہر کام کرسکتا ہے، ہر خطرے سے لڑ سکتا ہے۔ مرنے سے پہلے جینا تمام طرح کے خدشات و خطرات کا پوری سچائی اور جرات مندی سے سامنا کرنے کے بعد اپنی زندگی کو اچھے احساسات وافکار کے سپرد کردینے کے ہم معنی ہے۔ کسی ایک کمزور، منفی جذبے کا صحیح معنوں میں سامنا کرلیا جائے یا اس میں سے اچھی طرح سے گزر لیا جائے تو وہ دوبارہ انسانی ذہن کی دنیا میں قدم رکھنے کی ممکن حد تک جسارت نہیں کرتا۔ اگر ایک ہی منفی جذبہ بھولے بسرے پھر انسانی ذہن پر دستک دے دے تو

میز بان کو اس سے ملنے کے لیے دروازہ ضرور کھولنا چاہیے۔ میز بان کو یہ جان لینا چاہیے کہ یہ مہمان اجنبی نہیں ہے، اسی کے گھر کا، اسی کی ذات کا حصہ ہے۔ وہ اس سے صلح صفائی سے مل لے گا تو ممکن ہے وہ دوبارہ اس کے گھر پہ دستک نہ دے۔ کمزور خیالات کا سامنا کر لینے کے بعد اکثر اوقات وہ ہمیشہ کے لیے ختم نہیں ہو پاتے تو اس لیے کہ ان خیالات کی کوئی نہ کوئی جڑ ابھی تک انسانی ذہن کی مٹی میں کہیں نہ کہیں باقی ہوتی ہے؛ تاہم اگر ان خیالات پر نظر رکھی جائے، اگر بار بار ان کا جرات مندی سے سامنا کیا جائے تو ان کی جڑیں رفتہ رفتہ سوکھنا شروع ہو جاتی ہیں۔

ایک معیاری زندگی کا تجربہ کرنے کے لیے موری تمام طرح کے منفی جذبوں کا دیانت داری سے سامنا کر کے پھر ان سے جدا ہونے کی مشق کرنے کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ وہ زندگی کے معاملات سے وابستہ ہو کے اس سے غیر وابستہ ہونے کی طرف دھیان دلاتا ہے۔ موری زندگی کے معنی بیان کرنے سے پہلے زندگی کی بے معنویت، لغویت اور اس کے تاریک پہلوؤں (منفی جذبوں) کو بالخصوص سامنے لاتا ہے:

> ''اپنے آپ کو ان جذبات میں غرق کر کے، ان میں ڈوب کر ہی تم ان کو پاسکو گے۔ تم سمجھ لو گے کہ درد کیا ہے۔ تم سمجھ لو گے کہ خوف کیا ہے۔۔۔ پھر تم کہہ سکو گے کہ میں اس جذبے سے گزر چکا ہوں، میں اس سے واقف ہوں، اب میں اپنے آپ کو کچھ لمحوں کے لیے اس جذبے سے علیحدہ کرنا چاہتا ہوں۔'' (۲۰)

عام طور پر ایک ہی طرح کے خدشے، وسوسے خود کو بار بار دہراتے ہیں۔ بیشتر اندیشوں، گمانوں اور کمزور رویوں کی گہرائیوں میں بالعموم بزدلی کا رویہ اپنا کام کر رہا ہوتا ہے۔ آدمی تب تک خود کو کمزور، بزدل اور قابل ترس محسوس کرتا ہے جب تک وہ اپنے اختیار کی قوت اور اس کے صحیح استعمال سے پوری طرح سے واقف نہیں ہو پاتا۔ جب آدمی حقیقی طور پر خود آگہی کے عمل سے گزرتا ہے تو وہ جانتا ہے کہ فطرت نے سب انسانوں کے ساتھ سانجھا سلوک کیا ہے۔ کوئی کسی سے برتر، کوئی کسی سے کم تر نہیں۔ یہ بڑی حد تک آدمی کے اختیار میں ہے کہ وہ چاہے تو خود کو کمزور سمجھ لے، چاہے تو جرات مند بنا لے۔ چاہے تو اپنا ہاتھ دینے والا بنا لے، چاہے تو محض انحصار کرنے والا۔ بلاشبہ کسی آدمی کے خوف زدہ و کمزور ہونے کی وجہ معاشرتی و اقتصادی صورت حال بھی ہو سکتی ہے؛ تاہم محض اسی سوچ پر اکتفا کرنے کے نتیجے میں آدمی کی شخصیت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ خوف زدگی اور بزدلی سراسر نقصان دہ رویے ہیں۔ بقول سارتر:

> ''بزدل کا تعین اس کے اعمال سے ہوتا ہے۔ جس بات کو لوگ مبہم طور پر خوف کے ساتھ محسوس کرتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ہم بزدل کو مجرم کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔۔۔ بزدل خود کو بزدل اور بہادر اپنے آپ کو بہادر بناتا ہے۔''(۲۱)

موری جرات مند، فراخ دل اور محبت دینے والے'' ہاتھ ''کو زندگی میں اہم جانتے ہیں۔ وہ محبت کو دنیا کا واحد منطقی عمل گردانتے ہیں۔ زندگی میں محبت کرنے کی اہمیت اور محبت نہ کر پانے کی صورت حال کے پیش نظر وہ مچل کے سامنے عظیم شاعر اوڈن کا یہ جملہ بار بار دہراتے ہیں:

''ایک دوسرے سے محبت کرو یا فنا ہو جاؤ۔''(۲۲)

موری جینے کے لیے محبت کے عمل کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ان کا مرنے سے پہلے مرنے کا فلسفہ آدمی کو اپنی حقیقت سے آگاہ رکھتا ہے۔اسی آگہی کے اندر سے جرات مندی کا اکھوا پھوٹتا ہے۔خود سے آگاہ ہونا، فطرت سے، دوسروں کی حقیقت سے آگاہ ہونا بھی ہے۔موری اپنے آپ سے، فطرت سے، اپنے معاشرے کے کلچر سے آگاہ ہوتے ہیں۔کلچر سے آگہی کے نتیجے میں وہ اس کو من وعن قبول نہیں کر لیتے۔یعنی وہ کلچر سے سب کچھ نہیں لیتے کہ کلچر سے سب کچھ لینے کے قابل نہیں ہوتا۔موری اپنا کلچر خود پیدا کرتے ہیں۔اپنی زندگی کے معانی اور قدروں کا تعین خود کرتے ہیں۔وہ سماج کی ہو بہو نقل نہیں کرتے؛اپنا''سماج''خود تخلیق کرتے ہیں۔موری اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں ، حوصلے اور اطمینان کے ساتھ اس سوال پر غور کرتے ہیں کہ زندگی میں آدمی کو کس شے کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے ؟انھیں اپنی پوری زندگی کے تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ خود کو زندہ محسوس کرنے کے لیے دوسروں سے محبت کرنا، ان کے لیے اپنے دل میں درد محسوس کرنا انسانی سوچ کی اعلا منزل ہے:

> ''مچ۔اب جب کہ میں تکلیف میں ہوں، تو میں دوسرے تکلیف میں مبتلا لوگوں سے نزدیک محسوس کرتا ہوں۔ گزشتہ رات میں نے ٹی وی پر دیکھا، لوگوں پر گولیاں برس رہی تھیں اور وہ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے، بے گناہ لوگ مر رہے تھے، مجھے رونا آگیا۔ان کا درد مجھے اپنا درد محسوس ہوا۔میں ان میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا۔میں اسے کیسے بیان کروں، مجھے ان کی سمت کشش محسوس ہو رہی تھی۔''(۲۳)

دوسروں سے محبت کرنا، ان کے بارے اپنے دل میں درد محسوس کرنا، خود سے محبت کرنا، خود کے بارے میں درد محسوس کرنا ہے۔خود سے محبت کرنے کے صحیح معنی بھی دوسروں سے محبت کرنے کے ہی ہیں۔موری کی عمر بھر کی فکر کے حاصل کے مطابق اچھے جذبوں کے ساتھ جینا، محبت کرنا، بامقصد، بامعنی زندگی بسر کرنے کے ہم معنی ہے۔موت کی یاد سے موری بزدلی کے جذبات کو مٹانے اور بہادری کے جذبات کو بیدار کرنے کا کام لیتے ہیں؛ جبکہ دوسروں پر توجہ دینے اور محبت کرنے کے عمل سے اپنے جسم و روح کو توانا رکھنے کا۔بقول صغیر ملال(۱۹۵۱ء۔۱۹۵۲ء):

''دنیا کا ہر قابل ذکر دماغ بالآخر محبت، موت اور وقت کی تثلیث میں گم ہو جاتا ہے۔''(۲۴)

موری کی حیات پر غور کیا جائے تو وہ بھی اسی تثلیث میں گم ہیں۔بامعنی زندگی اور محبت کی اہمیت سے متعلق موری کے یہ اقوال اس ناول کی روح کے نمائندہ ہیں:

> ''آپ اپنی زندگی میں معنی اس وقت پیدا کرتے ہیں جب آپ اپنے وجود کو دوسروں سے محبت کرنے کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔اپنے سماج کے لیے، اپنے آپ کو وقف کرتے ہیں اس مقصد کو تراشنے میں جس کا کوئی مقصد یا معنی ہو۔''(۲۵)

''زندگی میں سب سے اہم بات یہ سیکھنا ہے کہ آپ محبت کیسے بانٹیں، اور کیسے وصول کریں۔''(۲۶)

''یاد ہے میں نے بامقصد زندگی کے لیے کیا کہا تھا؟ میں نے اسے لکھ لیا تھا لیکن اب یہاں دہرا سکتا ہوں۔ اپنی زندگی دوسروں کی محبت کے لیے وقف کر دو، اپنی زندگی اپنے محلے کے لیے وقف کر دو اور اپنے آپ کو ایسی چیزوں کے لیے وقف کر دو جن میں تمھیں کوئی مقصد اور معنی نظر آتے ہیں۔''(۲۷)

''دوسروں میں دلچسپی لینے سے ہی مجھے اپنے زندہ ہونے کا احساس ملتا ہے۔ یہ احساس مجھے اپنی گاڑی سے یا اپنے مکان سے نہیں ملتا۔ آئینے میں اپنی حالت دیکھنے سے بھی نہیں ملتا۔ جب میں کسی کو اپنا وقت دیتا ہوں، جب میں کسی اداس چہرے پر مسکراہٹ لا سکتا ہوں، تو مجھے صحت مند ہونے کا احساس ہوتا ہے۔''(۲۸)

''میرے لیے ٹیڈ، زندگی کے معنی ہیں دوسروں لوگوں سے ربط رکھنا۔ زندگی کے معنی ہیں کہ میں اپنے جذبات اور محسوسات دکھا سکوں۔ دوسروں سے بات کر سکوں ان کے ساتھ حسیت میں شریک ہو سکوں۔''(۲۹)

''جب تک ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے رہیں گے، ہمیں محبت کے جذبے کا ادراک رہے گا، ہم مر تو جائیں گے لیکن فنا نہیں ہوں گے، تمھاری پیدا کی ہوئی محبت باقی رہے گی۔ یادیں زندہ رہیں گی۔ تم ان لوگوں کے دلوں میں زندہ رہو گے جن سے تمھارا واسطہ پڑا، جنہیں تم نے پروان چڑھایا۔''(۳۰)

معنی کے کئی رنگ ہیں، محبت کے کئی روپ ہیں۔ موری اور مچل ایک دوسرے سے باتیں کرتے، ایک دوسرے سے مکالمے کا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے پہ پوری توجہ دیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامتے ہیں۔ ایک دوسرے کو گلے ملتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لمس کو، اس لمس سے پھوٹنے والی خوشبو کو محسوس کرتے ہیں۔ وہ دونوں شوق سے ایک دوسرے کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں۔ مچل، موری کے لیے دوائیاں لاتا ہے۔ اس کے پسندیدہ کھانے اسے اپنے ہاتھوں سے کھلاتا ہے۔ وہ لیٹے ہوئے موری کو بٹھاتا ہے۔ اس کی عینک کو اس کی آنکھوں پہ جماتا ہے۔ مچل، موری کی پوری ہستی کو اپنے اندر جذب کرتا، اسے لکھتا، اس کے ہونے کو خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ مچل، موری کی ایک مسکراہٹ کی خاطر میلوں سفر طے کر کے اس کے پاس آتا ہے۔ موری مچل کو تنہائی، خوف، لالچ، غصے، بیزاری، نفرت، تکبر، حسد، تنگ نظری، ضد، منتقم مزاجی اور موت کے معنی بتاتا ہے۔ موری مچل کو رشتہ ازدواج میں بندھنے کے، بے خوفی و بے غرضی، نرمی و زندہ دلی، محبت و عجز، فراخ دلی، آنسوؤں، دردمندی اور زندگی کے معنی بتاتا ہے۔

موری اٹھتر برس کی عمر میں اپنی ماں کو یاد کر کے روتا ہے۔ موری کی بیوی، بچے، دوست اور شاگرداس کا خیال رکھ کے گہری خوشی محسوس کرتے ہیں۔ سب موری سے محبت کا اظہار کر کے اپنے دل میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ موری سب پر توجہ دے کے، ان کے دل کی باتیں سن کے، انھیں اپنا دل بانٹنے کا موقع عطا کرتا ہے۔ وہ اپنے پاس آنے والے ہر شخص کے دل میں محبت اور نرمی کے جذبات بیدار کرتا ہے۔ یہی اس ناول کی سب سے اہم خاصیت ہے کہ اس کا مرکزی کردار قاری کے اندر سوئے ہوئے اچھے جذبات کو جگاتا ہے۔ ان جذبات کو تادیر زندہ رکھنے کا نہ صرف ہنر سکھانے کی خواہش کرتا ہے؛ بلکہ ان جذبات کو اپنی زندگی میں ممکن حد تک شامل رکھنے کا شوق بھی دلاتا ہے۔

موری جن جذبات کو قاری کے دل میں ابھارتے ہیں وہ صحت مند جذبات ہیں نا کہ وہ جذبات جو آدمی کی فکر کو معطل کر کے، یا اس پر غلبہ پا کے اسے دھوکا دے جاتے ہیں۔ موری منفی اور مثبت جذبات کے فرق اور حقیقت کا بخوبی ادراک رکھتے ہیں۔ وہ بزدلی اور مایوسی کے جذبات کی حقیقت سے گہری آشنائی حاصل کرنے کے بعد ہی مثبت جذبات کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرتے ہیں:

> ''کچھ صبحیں ایسی ہوتی ہیں کہ میں روتا ہوں، خوب روتا ہوں، اپنا سوگ مناتا ہوں۔ کچھ صبحیں ایسی ہوتی ہیں جب میں بہت تلخ اور غصہ ور ہوتا ہوں۔ لیکن یہ سب زیادہ دیر نہیں رہتا۔ میں اٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور کہتا ہوں'' مجھے جینا ہے۔۔۔''(۳۱)

موری اپنے خیالات کی بہتی ندی میں آنے والے میلے'' پانی ''کی حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں؛ مگر اجلے پانی کے آنے کی امید چھوڑتے نہیں ہیں۔ مذکورہ سب باتیں اپنی جگہ؛ مگر ہمیں اس نکتے کو دہرانے، اس پر گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے کہ واقعی میں مرنا سیکھنا، اپنے لالچ اور اندیشوں پر قابو پانا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ موری کے مثالی خیالات کی ایک وجہ ان کی عمر، ان کی جسمانی صورت حال ہو سکتی ہے؛ مگر موری اس مشکل صورت میں منفی خیالات و جذبات کا راستہ بھی اختیار کر سکتے تھے۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ موت کی حقیقت کا سامنا کرنے، محبت کرنے کے جذبات کے پیچھے ان کی گذشتہ زندگی کی، زندگی کو بامعنی بنانے کی مسلسل کی طویل جد و جہد موجود تھی۔ انھوں نے بیمار ہونے سے پہلے ہی جینے کے کچھ اصول اپنا رکھے تھے۔ وہی ان کے کام آئے۔ ان کے پاس بہتر طور پر جینے کا علم بھی تھا اور جینے کے بہترین ذرائع بھی، یعنی ان کے رشتے، جو انھوں نے عمر بھر کی توجہ اور محبت سے بہ طور انعام پائے تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں موری کا اکاؤنٹ خالی ہو کے رہ گیا تھا؛ مگر موری کی توجہ حاصل کرنے والے جانتے تھے کہ وہ حقیقی طور پر کس قدر امیر آدمی تھے۔ ان کے آخری ایام میں دنیا کے مختلف ممالک سے ان کے طلبا و طالبات، ان کا آخری بوسہ لینے، ان کی آخری مسکراہٹ دیکھنے، انھیں یہ بتانے کے لیے آتے ہیں کہ وہ خوش نصیب ہیں کہ انھیں موری جیسا استاد نصیب ہوا۔

دولت، عزت، شہرت، محبت اور بنیادی تحفظ کی ضرورتیں پوری نہ ہوئی ہوں تو آدمی کے لیے لالچ، تنگ نظری اور عدم تحفظ کے جذبات پر قابو پانا اور مشکل ہو جاتا ہے۔ کسی بھی ضرورت مند شخص کے لیے کسی کی مدد کرنا، کسی سے حقیقی معنوں میں محبت کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے بعد ہی اعلا ضرورتوں کا، ایثار و قربانی کا سفر شروع ہوتا ہے؛ مگر وہ معاشرہ جہاں تنگ نظری اور خود غرضی کا

چلن عام ہوں وہاں اپنے دل کو کھلا کرنا اور زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ موری ہر طرح کی صورت حال میں انسانیت کے لیے اپنے دل کو کھلا رکھنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں:

> ''انسانیت کو ایک خاندان کے طور پر مضبوط کرو، انسانوں پر اعتماد کرو۔ ایک چھوٹا سا حلقہ ان لوگوں کا بناؤ جن سے تم محبت کرتے ہو اور جو تمھیں عزیز رکھتے ہیں۔''(۳۲)

موری کے مذکورہ خیالات حقیقت پسندانہ ہیں کہ ہم اپنی زندگی میں چند ایک انسانوں پر ہی مکمل توجہ دینے کے قابل ہو پاتے ہیں اور چند ایک انسان ہی ہوتے ہیں جو واقعی میں ہماری ذات سے کوئی داخلی سروکار رکھتے ہیں۔

مجموعی طور پر اس ناول کا معنی کے تناظر میں محاکمہ کیا جائے تو محض یہ ناول ہی ہماری توجہ جینے کے معنی کی طرف نہیں دلاتا؛ بلکہ مذاہب اور دیگر علوم بھی ظلمت سے گزر کے روشنی میں آنے کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ مذاہب خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت میں جینے کے معنی کا سراغ پانے کی جستجو کرتے ہیں۔ بعض فلسفی (وجودیت پسند) اور نفسیات دان (فرائیڈین) اپنی مدد آپ کے تحت زندگی کا سفر پایہ تکمیل تک پہنچانے کی طرف دھیان دلاتے ہیں؛ جبکہ موری اپنی ذات کے لیے سادہ طرز زندگی کا انتخاب کرتے ہوئے، کسی بھی شکل، کسی بھی صورت میں، دوسروں سے محبت کے اظہار کو زندگی کے معنی و مفہوم سے عبارت گردانتے ہیں۔ معنی کے مختلف راستے ہیں۔ معنی کے مختلف سرچشمے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ کوئی معنی کسی کے لیے کتنا کار آمد اور کتنا دیرپا ثابت ہوتا ہے۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ کوئی معنی محض کسی کی یادداشت کا حصہ ہی بن پاتا ہے یا واقعی میں اس معنی کا کسی کی ذات کو کچھ فائدہ بھی ہو پاتا ہے۔ معنی اپنی ماہیت میں زندہ وجود کا نام ہے یا یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ معنی اپنی ماہیت میں زندہ احساس اور متحرک فکر کا نام ہے۔ معنی چلتی ندی کی مانند ہے۔ یہ رکتا بھی ہے، میلا بھی ہوتا ہے؛ مگر آدمی معنی کی وقتی طور پر گدلا جانے والی ندی کے خلاف مزاحمت نہ کرے، وہ اسے چلنے دے، اپنے آپ کے اوپر سے گزر جانے دے تو رواں ندی کچھ ہی دیر میں خود بخود ہی صاف ہو جاتی ہے۔ معنی کے چشمے میں جذبے سے ابال پیدا ہوتا ہے؛ مگر یہ دیکھنا، فرق کرنا ضروری ہے کہ وہ ابال آدمی کی ہستی کا احساس کے ساتھ رشتہ کمزور کرتا ہے یا مضبوط۔ بقول جون میک مرے:

> ''جب کوئی چیز ہمیں جوش دلائے اور جذبات کو اکسائے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم اسے محسوس نہیں کر رہے۔ اسی بات کو ہم ایک اور طرح سے بھی کہہ سکتے ہیں۔ جذبات سے لطف اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم غیر حقیقی یا رقت پرستانہ طور پر محسوس کر رہے ہیں۔ جب ہمارے جذبات حقیقی ہوتے ہیں تو ہم ان سے نہیں، خود اس چیز سے لطف اٹھاتے ہیں۔''(۳۳)

موری جذبات کے اظہار کو شرمناک نہیں سمجھتے بتاہم وہ جن جذبات کے اظہار کا انتخاب کرتے ہیں، ان پر انھیں شک نہیں ہوتا۔ ان کے فکر و جذبات میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یعنی ایسا نہیں کہ انھوں نے ایک جذبے کا اظہار کر دیا ہو تو بعد میں ان کی فکر ان کے اس عمل پر انھیں

ملامت کرتی ہو۔ وہ اپنے افکار کی ہی نہیں، جذبات کی بھی اس قدر کانٹ چھانٹ کر لیتے ہیں کہ بچنے والے افکار و جذبات ان کی شخصیت کے استحکام کا باعث بنتے ہیں ناکہ ان کی یا دوسروں کی زندگی کے لیے کسی خطرے کا باعث۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ماریو برگھس یوسا، نوجوان ناول نگار کے نام خطوط (ترجمہ) محمد عمر میمن، (کراچی: شہر زاد، ۲۰۱۰ء)، ص:۱۴

۲۔ہرمن ہیسے کا ناول: سدھارتھ، براؤنی ویئر کا ناول: The Top Five Regrets of the Dying، جوسٹین گارڈر کا ناول: سوفی کی دنیا، ارنسٹ ہیمنگوے کا ناول: بوڑھا اور سمندر، پاؤلو کولہو کا ناول: الکیمسٹ، طاہر بن جلون کا ناول: روشنی کی یہ خیرہ کن نابودگی، ایلف شفق کا ناول: چالیس چراغ عشق کے، اشفاق احمد کا ڈراما: من چلے کا سودا، اشفاق احمد کا افسانہ: گڈریا، انتظار حسین کا افسانہ: زرد کتا، ناصر عباس نیر کا افسانہ: خاموشی کا سر، مذہبی صحائف، حضرت علی کی کتاب: نہج البلاغہ، مولانا روم کی مثنوی معنوی، مولانا گل حسن شاہ کی: تذکرہ غوثیہ، بھگت کبیر کی: بھگت کبیر کی شاعری، افلاطون کی: مکالمات افلاطون، لین یوتانگ کی کتاب: جینے کی اہمیت، ول ڈیورانٹ کی کتابیں: زندگی کیا ہے؟ خزاں زدہ پتے، رائنر ماریہ رلکے کی کتاب: نوجوان شاعر کے نام خطوط، شہزاد احمد کی: ابراہام ماسلو، اعلے ترین انسانی واردات، ایرک فرام کی کتابیں: صحت مند معاشرہ، نیا انسان اور نیا سماج، برٹرینڈرسل کی کتابیں: رسل کے تشکیکی مضامین، لوگوں کو سوچنے دو، سنیکا کی کتاب: On the Shortness of life، ارنسٹ بیکر کی: موت سے انکار، محمد سلیم الرحمن کی ترجمہ شدہ کتاب: اسیر ذہن، آصف فرخی کی: دہشت گردسے گوتم بدھ کی ملاقات، ناصر عباس نیر کی کتابیں: ہائیڈل برگ کی ڈائری، نئے نقاد کے نام خطوط، (یہ نامکمل فہرست ہے۔)

۳۔ول ڈیورانٹ، خزاں زدہ پتے، (ترجمہ) ڈاکٹر ثوبیہ طاہر، (لاہور: نگارشات، ۲۰۱۶ء)، ص:۳۵

۴۔فریب نظر، (ترجمہ)، سید سعید نقوی، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۸ء)، ص:۱۷۶

۵۔ایضاً، ص:۲۱۰

۶۔ایضاً، ص:۲۷۱

۷۔شہزاد احمد، شوماخر، پریشان حالی سے نجات، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء)، ص:۲۲۹

۸۔مولانا ابوالکلام آزاد، غبار خاطر، (لاہور: مکتبہ رشیدیہ، ۱۹۸۸ء)، ص:۶۳

۹۔ قاضی جاوید، وجودیت، (لاہور: تخلیقات، ۱۹۹۸ء)، ص:۱۰۴

۱۰۔ایضاً، ص:۱۰۵

۱۱۔ژاں پال سارتر، وجودیت اور انسان دوستی، (مترجم) قاضی جاوید، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۲۰ء)، ص:۵۶

۱۲۔ قاضی جاوید، وجودیت، (لاہور: تخلیقات، ۱۹۹۸ء)، ص:۱۱۱

۱۳۔بیسویں صدی کے شاہکار افسانے، (مترجم) صغیر ملال، (کراچی: ویلکم بک پورٹ، ۲۰۱۲ء)، ص:۳۰

۱۴۔فریب نظر، (ترجمہ)، سید سعید نقوی، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۸ء)، ص:۱۹۳

۱۵۔ایضاً، ص:۲۷۲

۱۶۔ایضاً، ص:۲۷۲

دیکھیے: فریب نظر، (ترجمہ)، سید سعید نقوی، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۸ء)، ص:۲۶۱

’’میں اپنی زندگی میں جہاں بھی گیا، لوگوں کو ہمیشہ مزید اور نیا ہڑپ کرنے کی کوشش میں ہی دیکھا۔ نئی گاڑی ہڑپ کرلوں۔ نئی جائداد ہڑپ کرلوں۔ کوئی نیا کھلونا ہڑپ کرلوں۔ اور پھر اس کی نمائش کی خواہش۔۔۔ پتہ ہے میں نے اس سے ہمیشہ کیا مطلب نکالا ہے؟ یہ لوگ محبت کے اتنے بھوکے ہیں کہ یہ اشیاء میں متبادل تلاش کریں۔‘‘

دیکھیے: فریب نظر، (ترجمہ)، سید سعید نقوی، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۸ء)، ص: ۱۸٦

’’مرنا، موری اچانک بولے ’’ایک اداسی کی بات ضرور ہے لیکن ناخوش زندہ رہنا ایک اور ہی عذاب ہے۔ مجھے ملنے کے لئے آنے والے بہت سے لوگ ناخوش ہیں۔‘‘

دیکھیے: فریب نظر، (ترجمہ)، سید سعید نقوی، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۸ء)، ص: ۲۰۵

’’سچ، میں اپنے آپ کو اس سے زیادہ افسردگی کی اجازت نہیں دیتا۔ ہر روز تھوڑی سی افسردگی، چند آنسو، اور بس۔‘‘ میں نے ان تمام لوگوں کے بارے میں سوچا جو اپنے جاگتے وقت کا بیشتر حصہ اپنے اوپر رحم کھانے میں مشغول رہتے ہیں۔‘‘

۱۷۔ ایضاً، ص: ۲۱۰

۱۸۔ ایضاً، ص: ۲۲۵

۱۹۔ ایضاً، ص: ۲۲۵

دیکھیے: فریب نظر، (ترجمہ)، سید سعید نقوی، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۸ء)، ص: ۲۲۷

’’سچ یہ ہے کہ اگر تم آئینے میں دیکھ کر، یہ بات مان لو کہ موت کسی وقت بھی آسکتی ہے تو ہو سکتا ہے تم اتنے آرزومند اور ترقی کے متلاشی نہ رہو جتنے تم ہو۔‘‘

دیکھیے: فریب نظر، (ترجمہ)، سید سعید نقوی، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۸ء)، ص: ۲۲۵

’’ایسا کرو جیسے بدھ مت کے ماننے والے کرتے ہیں۔ ہر صبح آئینے کے سامنے سوال کرو؛ کیا میں آج مر جاؤں گا؟ کیا میں اس کے لیے تیار ہوں۔ کیا میں اپنی ساری ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو رہا ہوں، کیا میں وہ سب کر رہا ہوں جو میں کرنے کی خواہش رکھتا ہوں؟‘‘

۲۰۔ ایضاً، ص: ۲۴۳

۲۱۔ ژاں پال سارتر، وجودیت اور انسان دوستی، (مترجم) قاضی جاوید، (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۲۰ء)، ص: ۴۴

۲۲۔ فریب نظر، (ترجمہ)، سید سعید نقوی، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۸ء)، ص: ۲۳۳

۲۳۔ ایضاً، ص: ۱۹۹

۲۴۔ بیسویں صدی کے شاہکار افسانے، (مترجم) صغیر ملال، (کراچی: ویلکم بک پورٹ، ۲۰۱۲ء)، ص: ۱۶۹

۲۵۔ فریب نظر، (ترجمہ)، سید سعید نقوی، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۸ء)، ص: ۱۹۳۔

دیکھیے: فریب نظر، (ترجمہ)، سید سعید نقوی، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۸ء)، ص: ۲٦۲

’’پتہ ہے اطمینان کس چیز سے ملتا ہے؟ کس چیز سے؟‘‘ جو تم دے سکو اس سے، دوسروں کو دینے سے۔‘‘

۲٦۔ فریب نظر، (ترجمہ)، سید سعید نقوی، (کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۸ء)، ص: ۲۰۰

۲۷۔ ایضاً، ص: ۲٦۳

۲۸۔ ایضاً، ص: ۲٦۴

۲۹۔ ایضاً، ص: ۲۹۳

۳۰۔ایضاً،ص:۳۰۴

۳۱۔ایضاً،ص:۱۷۷

۳۲۔ایضا،ص:۲۸۹

۳۳۔اسیر ذہن،(مترجم)محمد سلیم الرحمن،(لاہور:ادارہ تالیف وترجمہ پنجاب یونیورسٹی،۱۹۹۸ء)،ص:۱۰۹